تیسری دنیا کے سیاسی مدوجذر پر مبنی ناول

عوام کا نمائندہ

چنوا اچیبے

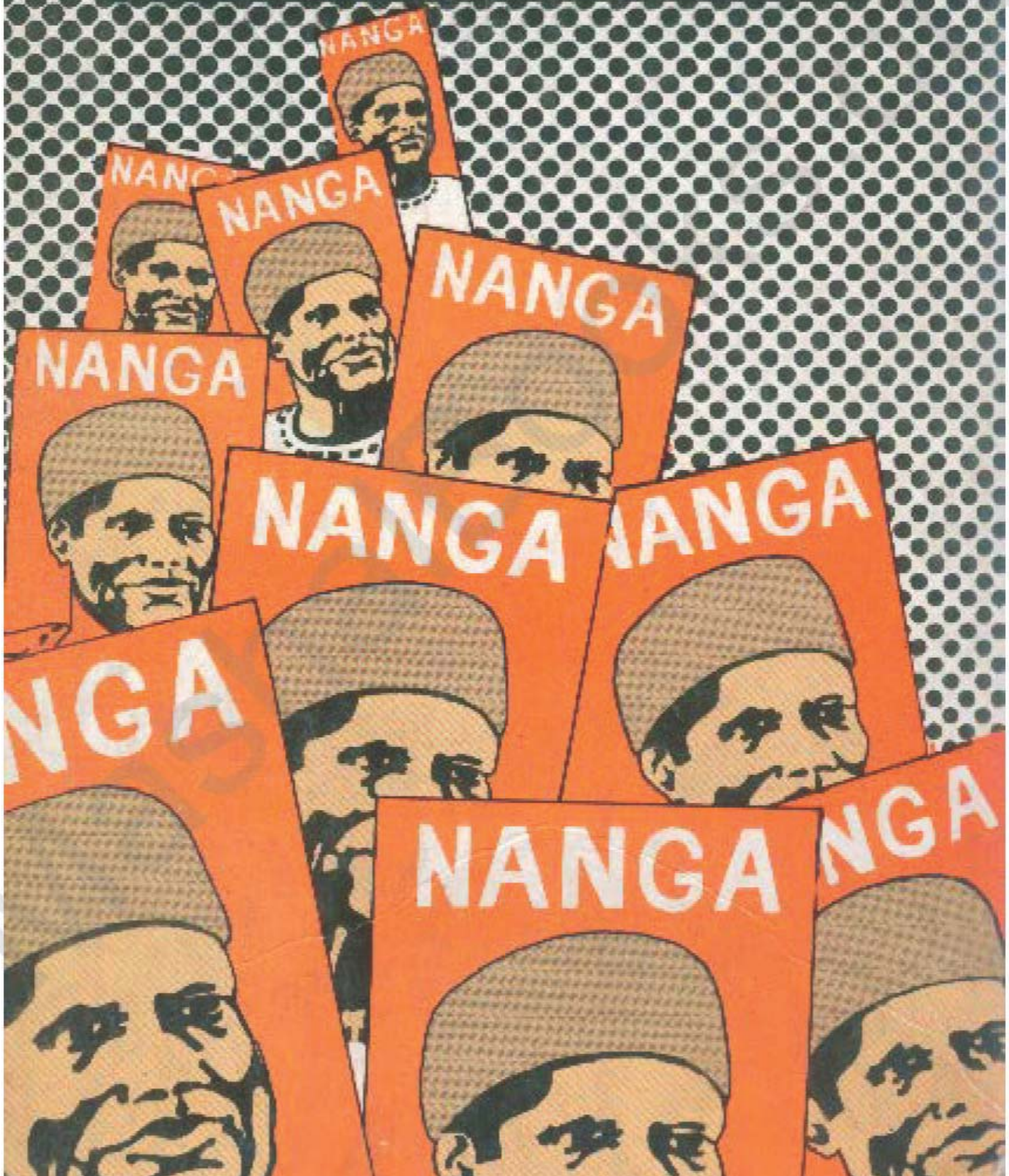

تیسری دنیا کے سیاسی مدوجذر پر مبنی ناول

عوام کا نمائندہ

چھنوا اچیبے

مترجم

تنویر جہاں

مشعل

آر۔بی 5 ' سیکنڈ فلور' عوامی کمپلیکس

عثمان بلاک' نیوگارڈن ٹاؤن' لاہور54600 ' پاکستان

MashalBooks.org

دیباچہ

ایشیاء افریقہ اور لاطینی امریکہ نو آزاد یا نیم آزاد ملکوں کے ادیب اپنی تخلیقات میں نوآبادیاتی نظام کے بعد کی صورت حال پیش کر رہے ہیں۔ اس مقصد میں یقیناً ان کا یہ جذبہ بھی شامل ہوتا ہے کہ سیاسی، سماجی اور معاشی تبدیلیوں کے ساتھ ان معاشروں میں انسانی رشتے جس تخریب و تبدیلی کا شکار ہیں، ان سے بھی دنیاکو آگاہ کیا جائے۔ صرف دنیا ہی کو آگاہ نہ کیا جائے بلکہ کہانیوں، ناولوں، ڈراموں اورنظموں کے ذریعہ خود بھی اس تبدیلی کے عمل سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہی ہیں اور ان طبقوں کی آواز دور دور پہنچائی جائے جو غیر ملکی آقاؤں سے آزادی کے باوجود جبر و استحصال کے شکنجے میں کسے ہوئے ہیں۔

افریقی ادب میں اس رجحان کے ساتھ ایک احساس یہ بھی ملتا ہے کہ سفید فام آقاؤں نے محکوم کا، سیاسی اور اقتصادی استحصال ہی نہیں کیا بلکہ انہوں نے ثقافتی اور تہذیبی سطح پر بھی ہر چیز کو تہس نہس کر دیا ہے۔ زبان کو بگاڑا رسوم و رواج کی رنگا رنگی ختم کی، جنگلوں، دریاؤں اور جانوروں کے ذریعے زمین کے ساتھ جو انسان کا رشتہ تھا، وہ بھی توڑ

MashalBooks.org

رشتے جوڑ رہے ہیں۔ اس کوشش میں وہ صحیح انگریزی زبان لکھنا بھی ضروری نہیں سمجھتے اور مقامی انگریزی میں کہانیاں لکھتے ہیں جو افریقی زبانوں کے ساتھ مل کر بنی ہے اور جسے PIDGIN انگلش کہتے ہیں ایوس ٹوٹولا جیسے ادیب اس کا بھی خیال نہیں رکھتے اور غالباً دانستہ اس سے بھی زیادہ غلط انگریزی لکھتے ہیں۔ روحوں' بھوت پریت اور جادوٹونے کی کہانیاں چونکہ مغرب میں بہت مشہور ہیں اس لئے ٹوٹولا اپنی غلط ملط انگریزی سے بھی قارئین کو بہت متاثر کرتا ہے لیکن قدیم رسم ورواج سے محبت اور انہیں اپنے معاشرتی نظام کا ایک لازمی حصہ سمجھنے والوں میں صرف ٹوٹولا جیسے مرد ہی شامل نہیں ہیں' نوبل انعام پانے والا ڈرامہ نگار اور ناول نویس شوئیکا نے بھی اپنے کئی ڈراموں میں رسوم اور ان توہمات کو موضوع بنایا ہے اور ان کے ساتھ اپنی ہمدردی اظہار کیا ہے۔ اس کا مشہور ڈرامہ Death and the King Horseman ایک ایسے موضوع پر ہے جو آج کی حقیقت پسندانہ زندگی میں قابل یقین نہیں مگر شوئیکا اسے ایک حقیقت بنا دیتا ہے۔ قبیلے کے سردار کی موت کے ساتھ ہی ضروری ہوتا ہے کہ اس کا سپہ سالار بھی اس کے ساتھ ہی مر جائے اس کے لئے کسی بیرونی امداد کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ یہ سالار سردار کی لاش کے ساتھ رات بھر بیٹھا رہتا ہے اور خود بخود اس کی روح اس کے جسم کا ساتھ چھوڑ جاتی ہے۔ علاقائی انگریز افسر اسے خودکشی گردانتا ہے اور ایک انسان کی موت روکنے کے لئے وہ قانون کا سہارا لیتا ہے۔ سپہ سالار کو قید کر لیتا ہے۔ قیدی سردار تو بچ جاتا ہے لیکن اس کا بیٹا جسے انگریزوں نے میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے انگلستان بھیجا ہے۔ اچانک واپس آ جاتا ہے اور باپ کی جگہ وہ مر جاتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس قسم کے موضوع مغربی قاری کو خوش کرنے کے لئے پیش کئے جاتے ہیں لیکن عقیدے کی بھی پختگی کے ساتھ انہیں پیش کیا جاتا ہے وہ بجائے خود اپنی جگہ ایک سچی اور حقیقی کہانی بن جاتی ہے۔

افریقی ادب میں سب سے نمایاں اور بہت بڑا حصہ نائجیریا کے ادیبوں کا ہے۔ شوئیکا نے نوبل انعام حاصل کیا۔ ان کے علاوہ ایموس ٹوٹولا' ٹی ایم الوکو' سپرمین اکومین اور جے پی کلارک دنیا بھر میں جانے جاتے ہیں۔

چینوا اچے بے (Chinua Achebe) شاید ان سب میں زیادہ مشہور ہے۔ وہ شوئیکا سے بھی پہلے کا لکھ رہا ہے اور اسے شہرت بھی بہت پہلے حاصل ہوگئی تھی۔ اس کا ناول Things Fall Apart نے 1958ء میں ہی تہلکہ مچا دیا تھا۔ اچے بے بھی نائجیریا

کے سیاسی اور معاشی حالات کو موضوع بناتا ہے لیکن وہ خاص طور پر مغربی قاری کے لئے نہیں لکھتا۔ اسی لئے وہ خالص مقامی حالات اور مقامی واقعات کے بارے میں زیادہ وضاحت نہیں کرتا وہ فرض کر لیتا ہے کہ ان سب چیزوں سے اس کا قاری بخوبی واقف ہے۔ اسی لئے وہ عام بول چال کی زبان استعمال کرنے میں بھی کسی پریشانی کا شکار نہیں ہوتا۔

اچے بے بھی اپنے ناولوں کے ذریعہ افریقہ اور بالخصوص نائجیریا کے لوگوں کو یہ بتانے کی کوشش کرتا ہے کہ آزادی کے بعد اس کے ملک میں کیا ہو رہا ہے۔ سفید فام آقاؤں کی کرسی جن کالے آقاؤں نے سنبھالی ہے' عام آدمی اور اپنے ملک کے ساتھ ان کا رویہ اور ان کا برتاؤ کیا ہے۔ بیسویں صدی میں نائجیریا اور خاص طور سے اس کے اپنے قبیلے ایبو (IBO) پر کیا گزر رہی ہے۔ اس کا ناول Things Fall Apart میں انگریزوں کی آمد سے قبل کی قبائلی زندگی Row of God میں انگریز افسروں اور عیسائی مشنریوں کی 1920ء کی سازش اور دیہی زندگی No Longer at Ease میں 1950ء کی ملی جلی تہذیب و ثقافت اور Man of the People میں آزادی کے بعد سیاستدانوں کی بدعنوانی دھوکہ فریب اور غریب عوام کی بے بسی، اس کے موضوع بیس سال کی خاموشی کے بعد 1987ء میں اچے بے کا جو نیا ناول Anthills of Savanah شائع ہوا ہے۔ اس کا موضوع 1970ء سے 1980ء تک نائجیریا میں فوجی حکمرانوں کی آمریت ہے۔

زیرِ نظر ناول عوام لیڈر میں لیڈر میں ہمیں اپنی کہانی نظر آتی ہے۔ اقتدار کرنے کے لئے سیاسی جوڑ توڑ اور اقتدار حاصل کرنے کے بعد ذاتی مفادات کا حصول۔ ان مقاصد کے راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو دور کرنے گھٹیا سے گھٹیا حربے کا استعمال اچے بے نے اس ناول میں صیغہ واحد متکلم استعمال کر کے اپنے آپ کو بہت زیادہ ملوث کر لیا ہے اور اب ساتھ پیش آنے والے واقعات کو ناول کے مرکزی کردار نے اپنے ملک کی تاریخ بنا دیا ہے یہی اس ناول کی خوبی ہے۔ عام طور پر سیاسی ناول ایک قسم کی دستاویزی فلم بن جاتے ہیں اس کے لئے کہا جاتا ہے کہ سیاسی ناول لکھنا بہت مشکل کام ہے لیکن اچے بے اس تنے ہوئے رسے پر سے نہایت آسانی کے ساتھ گزر گیا ہے۔

عوامی لیڈر نانگا کے ساتھ اس کا تعلق نانگا کی ہونے والی دوسری بیوی کے

ساتھ کا ربط بہ ضبط اپنے والد کے ساتھ اس کا رویہ اپنی دوست کے ساتھ رات گزارنے کی کوشش اور نانگا کی طرف سے نرس کی سازش اور پھر نوجوان سیاسی لیڈر میکس کی سیاسی شکست، یہ سب واقعات نہایت مہارت اور خوبی کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں کہ دستاویزی فلم بن جانے کا کہیں احساس نہیں ہوتا۔

اس ناول میں اچے بے اپنے ملک یا کسی نوآزاد افریقی یا ایشیائی ملک) کے سیاستدان کے چہرے پر سے ہی نقاب نہیں اٹھاتا بلکہ ان ملکوں کے عام آدمی کی ذہنیت کا بھانڈہ بھی بھوڑتا ہے اگر سیاستدان بے ایمانی، بددیانتی اور فریب دہی کرتے ہیں تو عام آدمی بھی اپنی سادہ لوحی یا خودغرضی کی بنا پر انہیں امداد وتعاون فراہم کرتا ہے۔ اس سلسلے میں ناول کا مرکزی کردار اوڈیلی کی زبان سے اچے بے کہتا ہے:

> ''اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ نانگا جیسے انسان جو غریب اور بے قدری سے اٹھ کر اعلیٰ مقام تک پہنچتا ہے، تھوڑی کوشش اور ترکیب کے بعد اس بات پر آمادہ کیا جا سکتا ہے وہ سب کچھ تج دے تو اسے انسانی سرشت سے لاعلمی ہی کہا جائے گا جو آدمی بارش میں بھیگتا اندر آیا ہے اور اس نے اپنے آپ خشک کیا ہے اس شخص کے مقابلے میں جو اندر بیٹھا دوبارہ بارش میں جانے پر راضی نہیں ہوگا اور ہم میں سے کوئی بھی ایک زمانہ سے اندر نہیں بیٹھا کہ وہ کہہ سکے'' جہنم میں جائے سب کچھ۔''

اس فلسفہ سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن جس مقصد کی طرف اس میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اسے (چند شخصیات کو جھٹلایا بھی نہیں جا سکتا۔ ناول میں فتح آخر کار بدمعاشی اور بددیانت نانگا کی ہوتی ہے اور غیبت پسند اور آدرش وادی میکس سیاست کی قربان گاہ پر اپنی جان نچھاور کرتا ہے لیکن کہانی یہاں ختم نہیں ہوتی۔ جنگ جاری رہتی ہے اور آخر میں اوڈیلی کہتا ہے:

> ''ایسے نظامِ حکومت میں ایک انسان اس وقت اچھی موت مرتا ہے جب اس کی زندگی کسی دوسرے شخص کو اتنا متاثر کر دے کہ وہ لالچ کے بغیر اس کے قاتل کے سینے میں گولیاں پیوست کر دے۔''

MashalBooks.org

اچے بے 1930ء میں نائجیریا کے قبیلے ایبو میں پیدا ہوا۔ نائجیریا کے عیسائی قبیلے پڑھے لکھے اور خوش حال تھے۔ اس نے نائجیریا کی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ پھر ایک طباعتی ادارے کا ڈائریکٹر بن گیا۔ 1961ء سے 1966ء تک ریڈیو کا ڈائریکٹر رہا۔ ناولوں کی شہرت کے بعد امریکہ کی میساچوسٹس یونیورسٹی میں استاد بن گیا۔ وہاں سے امریکی ریاست کنکٹی کٹ یونیورسٹی میں چلا گیا جہاں وہ 1976ء تک رہا وہاں سے وہ واپس نائجیریا آیا اور این سوکا یونیورسٹی ادب کا پروفیسر ہوگیا۔ آج کل وہ نائجیریا اور این سوکا یونیورسٹیوں میں پڑھاتا ہے۔ بیس سال تک اس نے کوئی ناول نہیں لکھا تھا۔ 1987ء میں اس کا نیا ناول Anthills of Savanah شائع ہوا ہے۔ دنیا بھر کے نقادوں نے اس ناول کو بہت پسند کیا ہے۔

اب ایک دو باتیں ترجمہ کے بارے میں بھی ہو جائیں تنویر جہاں نے اس ناول کا ترجمہ کیا ہے۔ ان کی یہ پہلی کوشش ہے اس اعتبار سے وہ واقعی کامیاب ہیں۔ افریقی ادیبوں کا ترجمہ کرتے ہوئے ایک مشکل ضرور پیش آتی ہے۔ یہ لوگ بگڑی یا بگاڑی ہوئی انگریزی (Pindgin English) لکھتے ہیں۔ خاص طور سے مکالموں میں اس کا بہت استعمال کرتے ہیں۔ اصولی طور پر تو اس کا ترجمہ کیا ہی نہیں جا سکتا لیکن تنویر جہاں نے اس کا ترجمہ کر دیا ہے۔ بڑی ہمت ہے ان کی، البتہ گیتوں کا وہ ترجمہ نہیں کر سکیں جو افریقی معاشرہ کو سمجھنے کے لئے ضروری تھے۔ بہر حال ترجمہ مجموعی طور پر اچھا ہے۔

مسعود اشعر

MashalBooks.org

پہلا باب

اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ معزز چیف ایم۔اے نانگا ملک کے سب سے زیادہ عوامی سیاستدان تھے۔آپ شہر یا اس کے آبائی گاؤں اناطہ میں کسی سے پوچھ لیں جواب ملے گا کہ وہ عوامی نمائندہ ہیں۔ مجھے شروع میں ہی یہ بات تسلیم کر لینی چاہئے ورنہ جو کہانی میں سنانے جا رہا ہوں بے معنی ہو جائے گی۔

اناطہ گریمر سکول میں جہاں میں اس وقت پڑھا رہا تھا' اس دوپہر وہ سٹاف اور طالب علموں سے خطاب کرنے والے تھے۔ وہ زبردست سیاسی بیداری کے دن تھے چنانچہ لوگ معمول کے مطابق بڑی تعداد میں جمع ہو گئے۔اسمبلی ہال میں گنجائش سے تین گنا بڑا مجمع اکٹھا تھا۔ بہت سے دیہاتی ڈائس کے پائے تک فرش پر بیٹھے تھے۔ میں نے ایک نظر مجمع پر ڈالی اور وقتی طور پر باہر ہی ٹھہرنے کا فیصلہ کیا۔

پانچ یا چھ رقاص گروپ باہر صحن میں مختلف جگہوں پر رقص کر رہے تھے۔خود پسند خواتین کی انجمن کی ہر دلعزیز عورتوں نے قیمتی لباس زیب تن کئے ہوئے تھے۔ بہت زیادہ شور شرابے کے باوجود گانے والے کی لوچ دار آواز میں آسانی سے گیت سنے جا سکتے تھے۔انہوں نے گانے والی کا نام ''گراموفون'' رکھا تھا۔ ذاتی طور پر میں خواتین کے رقص کی طرف توجہ نہیں دیتا لیکن جب یہ لوگ گا رہے ہوں تو سننا پڑتا ہے۔اب وہ میچا کی وجاہت بیان کر رہی تھی۔ جیسے وہ عقاب کے پھرتیلے اور ترشے ہوئے جسم سے تشبیہ دے رہی تھی کہ دور دراز کی سیاحت کرنے والے سیاح بھی اس کی ہر دلعزیزی کے معترف تھے۔ یہ میچا بلاشبہ محترم چیف نانگا ہی تھے جن کی ہر دلعزیزی پر سب رشک کرتے ہیں اور ان کی راہ میں کانٹے بچھاتے ڈرتے ہیں۔شکاریوں کی وردی میں ملبوس شکاری کلب کی ارکان کی آمد نے مجمع میں ہلچل مچا دی۔ یہاں تک کہ کچھ دیر کے لئے ''گراموفون'' نے

MashalBooks.org

بھی گانا بند کر دیا۔ یہ لوگ کسی کی موت یا کسی اہم تقریب کے سوا کبھی باہر نہیں آتے۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے انہیں آخری مرتبہ کب دیکھا تھا۔ انہوں نے بھری ہوئی بندوقیں کھلونوں کی طرح اٹھا رکھی تھیں۔ بندوقوں کی نال دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں ٹکراتے ہوئے وہ شکاری آپس میں جنگجوؤں کے انداز میں سلامی دیتے۔ مائیں اپنے بچوں کو سینے سے چمٹا لیتی اور کھینچ کر دور لے جاتیں۔ کبھی کبھی کوئی شکاری کسی کھجور کے درخت کی شاخ کا نشانہ لیتا اور درمیان سے توڑ دیتا۔ ہجوم تالیاں بجاتا۔ لیکن اس قسم کے نشانے بہت کم لئے جاتے۔ زیادہ تر شکاری اپنی بارود کو وزراء کے استقبال کے لئے بچا کر رکھتے کیونکہ موجودہ حکومت چار سال میں دوسری چیزوں کی طرح بارود کی قیمت میں بھی کئی بار اضافہ کر چکی تھی۔

میں اس شور شرابے میں ایک طرف کھڑا وزیر کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے اپنے حلق میں شدید کڑواہٹ کا احساس ہوا۔ یہ احمق اور جاہل دیہاتی ان لوگوں میں سے ایک ایسے آدمی کے انتظار میں پاؤں توڑ رقص کر رہے تھے اور اپنا بارود ضائع کرنے کا انتظار کر رہے تھے۔ جنہوں نے ملک کو افراط زر کی گہرائیوں میں دھکیل دیا تھا۔ میں کسی معجزے کسی طوفانی صدا کا منتظر تھا جو اس تقریب کا پانسا پلٹ دے اور ان احمقوں کو کچھ مفید سچائیوں کا پتہ دے لیکن یہ سب کچھ بے سود تھا۔ یہ لوگ نہ صرف جاہل بلکہ مقدر پرست بھی تھے۔ انہیں یہ بتایا جائے کہ اس آدمی نے امیر بننے کے لیے اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کیا ہے تو میرے باپ کی طرح وہ بھی یہی کہیں گے۔ تمہارا کیا خیال ہے اگر قسمت نے تر نوالا منہ میں ڈال ہی دیا ہے تو اسے اُگل دیا جائے۔

میں ہمیشہ سے مسٹر ناگا کو ناپسند نہیں کرتا تھا۔ تقریباً سولہ سال پہلے وہ میرے استاد تھے اور میں ان کا عزیز شاگرد۔ مجھے یاد ہے تب وہ ہر دلعزیز، جوان، خوبرو اور وجیہہ انسان تھے۔ وہ خاص طور پر اپنی سکاؤٹ ماسٹر کی وردی میں بہت جچتے تھے۔ سکول کی ایک دیوار پر صاف ستھری وردی میں ملبوس سکاؤٹ ماسٹر کی تصویر آویزاں تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ آیا آرٹ کے استاد کے ذہن میں تصویر بناتے وقت مسٹر ناگا کی تصویر ہی کہتے تھے۔ یہی بہت تھا کہ یہ دونوں وجیہہ اور موثر شخصیت کے اسکاؤٹ ماسٹر تھے۔ اس تصویر میں سکاؤٹ ماسٹر نے اپنے ہاتھ سینے پر باندھے ہوئے تھے اور دایاں پاؤں سلیقے سے کاٹے

ہوئے درخت کے ایک تنے پر رکھا ہوا تھا۔خوش نما رنگین پھولوں سے فریم کے چاروں کونوں کو آرائش کی گئی تھی اور نیچے یادگار الفاظ کندہ تھے ''میری دولت نہیں بلکہ میرا کردار میری ملکیت ہے'' یہ بات 1948ء کی ہے۔

جلد ہی نانگا سیاست میں حصہ لینے لگا اور اس نے پارلیمنٹ کی نشست جیت لی ان دنوں یہ کام آسان تھا کیونکہ ہمیں ووٹ کی قیمت معلوم نہیں تھی چند سال بعد میں اس کے بارے میں اخباروں میں خبریں پڑھتا اور ایک طرح سے اس پر فخر کرتا۔ان ہی دنوں میں نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا اور عوامی تنظیم پارٹی کی طالب علم شاخ کا خاصا سرگرم رکن تھا۔تب 1940ء میں پارٹی میں ایک رسوا کن واقعہ ہوا اور میں اس کے سحر سے مکمل طور پر آزاد ہوگیا۔

ان دنوں مسٹر نانگا حکمران پارٹی کے ایک گمنام رکن تھے۔ عام انتخابات نزدیک تھے۔ پی۔او۔پی ملکی سطح پر بہت مقبول تھی اور الیکشن میں شکست کے امکان کا کوئی خوف نہیں تھا کیونکہ حریف پارٹی کمزور اور غیر منظم تھی۔

تب کافی کی بین الاقوامی منڈی میں سرد بازاری آ گئی۔حکومت کو راتوں رات زبردست مالی بحران کا سامنا کرنا پڑا ''کم از کم ہمیں یہی محسوس ہوتا تھا'' ویسے بھی کافی ہماری معیشت کا سہارا تھی جس طرح کافی کے کاشت کار کے پشت پناہ تھے۔

اس وقت کا وزیرخزانہ بہت اچھا ماہر معاشیات تھا جس نے پبلک فنانس میں پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔اس نے صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے کابینہ میں ایک جلد منصوبہ پیش کیا۔

وزیراعظم نے اس منصوبے کو بری طرح رَد کردیا۔وہ کافی کے کاشت کاروں کو کم قیمت ادا کر کے اس نازک مرحلے پر انتخاب ہارنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔نیشنل بینک کو مزید پونڈ چھاپنے کی ہدایت کی گئی۔کابینہ کے دوتہائی ارکان نے وزیر کی حمایت کی۔اگلی صبح وزیراعظم نے انہیں برطرف کر دیا اور شام کو انہوں نے قوم سے خطاب کیا۔انہوں نے کہا کہ برطرف کیئے جانے والے وزراء سازشی اور غدار ہیں جو غیر ملکی تخریب کاروں سے مل کر نوآزاد قوم کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔

مجھے یہ تقریر اچھی طرح یاد ہے بلاشبہ اس وقت کوئی بھی حقیقی صورتِ حال سے

MashalBooks.org

باخبر نہیں تھا۔ اخباروں اور ریڈیو نے وزیراعظم کی من گھڑت کہانی کو صحیح پیش کیا۔ ہم لوگ بھی بہت برہم ہوئے۔ ہم نے طالب علم یونین کا ہنگامی اجلاس طلب کیا اور اپنے رہنما وزیراعظم کے لئے اعتماد کا ووٹ منظور کر کے ان بدمعاشوں کی گرفتاری کے لئے قانونی کارروائی کا مطالبہ کیا۔ سارا ملک لیڈر کے ساتھ تھا۔ جگہ جگہ احتجاجی مظاہرے ہوئے۔

یہی وہ مقام تھا جہاں میں نے ہمہ گیر آہ وزاری میں پہلی مرتبہ ایک نئی' خطرناک اور منحوس صورتِ حال دیکھی۔

ایک سرکاری جریدے ''ڈیلی کرانیکل'' نے اپنے ایک اداریہ میں اس بدمعاش گروہ کے متعلق لکھا کہ وہ سب یونیورسٹی سے فارغ التحصیل' انتہائی تعلیم یافتہ پیشہ ور لوگ ہیں (میرے پاس اس اداریہ کا تراشہ محفوظ ہے)۔ جس طرح ایک دندان ساز خراب دانت لوگوں کے منہ سے نکال پھینکتا ہے اسی طرح اب ہمیں اپنی سیاست سے ایسے تمام گھٹیا مغرب کے پٹھوؤں کو نکال باہر کرنا چاہئے جو معاشیات کی اضافی کتب میں الجھے ہوئے اور سفید فام لوگوں کی عادات و اطوار اور طرزِ گفتگو کی نقالی کرتے ہیں۔ ہمیں افریقی ہونے پر فخر ہے۔ ہمارے اصلی رہنما آکسفورڈ کیمبرج' یا ہارورڈ کے سند یافتہ نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو عوامی زبان بولتے ہیں لعنت ہے ایسی ملعون اور مہنگی یونیورسٹی کی تعلیم پر جو ایک افریقی کو اپنے قدیم اور شاندار افریقی کلچر سے بیگانہ کر دیتی ہے' اور وہ اپنے آپ کو عوام سے بلند سمجھنے لگتا ہے۔

دوسرے اخباروں نے لکھا کہ برطانیہ میں بھی جہاں بدمعاش گروپ نے نام نہاد تعلیم حاصل کی ہے۔ خزانے کا چانسلر بننے کے لئے ماہر اقتصادیات ہونا یا وزیر صحت بننے کے لئے ڈاکٹر ہونا ضروری نہیں۔ اصل بات پارٹی سے وفاداری ہے۔

میں اس دن مہمانوں کی گیلری میں ہی موجود تھا جب وزیراعظم نے اکثریت سے اعتماد کا ووٹ حاصل کیا اور اس دن حقیقت کھلے طور پر منکشف ہو گئی لیکن کسی نے اس طرف توجہ نہ دی۔ مجھے برطرف وزیر خزانہ کی پژمردہ شکل یاد ہے جب وہ یتیم کے ساتھ چیمبر میں داخل ہوئے۔ اس وقت اراکین اور مہمانوں نے ان پر آوازیں کسیں۔ اسی ہفتہ مشتعل ہجوم نے اس کی کار کو تباہ کر دیا اور اس کے گھر پر سنگ باری کی۔ ایک اور برطرف وزیر کو کار سے باہر کھینچا۔ مار مار کر بے ہوش کیا اور سڑک پر تقریباً پچاس قدم تک گھسیٹا گیا'

MashalBooks.org

پھر ہاتھ پاؤں باندھ کر اور منہ میں کپڑا ٹھونس کر سڑک کے کنارے پھینک دیا گیا جب اسمبلی کا اجلاس ہو تو وہ ہسپتال میں زیر علاج تھے۔

میرا پارلیمنٹ کا یہ پہلا اور آخری چکر تھا اور مسٹر نانگا کو 1948ء کے بعد جب وہ مجھے پڑھاتے تھے۔ پہلی بار دیکھا تھا۔

وزیراعظم نے تین گھنٹے تک تقریر فرمائی اور اس کے ہر لفظ پر تالیاں بجیں۔ اسے 'چیتا' 'شیر' 'آسمان' 'یکتا و یگانہ' 'سمندر' اور نہ جانے کن کن خطابات سے نوازا گیا۔ وزیراعظم نے کہا شرارت پسند گروہ اپنی مکروہ سازش میں موقع پر پکڑا گیا اور غیر ملکی دشمنوں کے ساتھ ساز باز کر کے اس حکومت کا تختہ الٹنا چاہتا تھا جو عوام کی ہے اور عوام کے لئے ہے۔

''انہیں پھانسی دی جائے'' پچھلی نشستوں سے مسٹر نانگا اونچی آواز میں چلائے۔ یہ مداخلت اتنی اونچی اور واضح تھی کہ اگلے روز روزنامہ ''بنسرڈ'' میں ان کے نام کے ساتھ یہ بیان شائع کیا گیا۔ اجلاس کے دوران وہ پیچھے بیٹھے شکاری کتوں کی طرح رسّی تڑوا کر اپنے شکار پر جھپٹنے کی کوشش کرتا رہا۔

اگر مسٹر نانگا کی مداخلتوں کا حساب لگایا جائے تو وہ ایک گھنٹے بھر کی بھوں بھوں تک پہنچ سکتی ہے۔ جیب میں وہ دخل اندازی کے لئے لپکتا یا تمسخر آمیز قہقہہ لگانے کے لئے بھوکے لکڑ بگّے کا ساتھ دینے بیٹھ جاتا تو پسینہ ان کے چہرے سے ٹپکتا ہوتا۔

جب وزیراعظم نے کہا ان احسان فراموش لوگوں نے اس شخص کی پیٹھ میں خنجر گھونپا ہے جو انہیں گمنامی کے غار سے نکال لایا تھا تو کچھ اراکین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

مسٹر نانگا نے کہا ''انہوں نے اس انگلی کو بھنبھوڑ ڈالا ہے جس سے ان کی ماں نے انہیں کھانا کھلایا تھا۔ یہ بات بھی روزنامہ بنسرڈ میں چھپی جس کا تراشہ میرے سامنے ہے۔ البتہ اس دن شعلہ بار فضا کو کتاب کے سرد لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

اس وقت میرے احساسات کیا تھے؟ مجھے یاد نہیں تاہم میں نے ساری کارروائی کو عجیب وغریب جانا تھا یا اس وقت کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کہانی کا کوئی اور رُخ بھی ہو سکتا ہے۔ وزیراعظم بول رہے تھے۔ انہوں نے اپنا مشہور (یا بدنام زمانہ) اعلان کیا۔ ''آج سے ہمیں اپنی بیش قیمت آزادی کا سختی سے تحفظ کرنا ہوگا۔ ہمیں اپنی اور افریقہ

MashalBooks.org

کی تقدیر کا فیصلہ ان مغربی تعلیم یافتہ گھمنڈی اور دوغلے دانشوروں پر نہیں چھوڑنا چاہئے جو اپنے معمولی مفاد کی خاطر اپنی ماؤں کو بھی بیچنے سے دریغ نہیں کریں گے۔

اس عرصے میں مسٹر نانگا نے کم از کم دو مرتبہ ''انہیں پھانسی دو انہیں پھانسی دو'' کا شور مچایا مگر اس کی آواز شور و غل میں دب گئی اس لئے ریکارڈ میں نہ آسکی۔

مجھے سابق وزیراعظم' ڈاکٹر میکانڈے کی شخصیت آج بھی یاد ہے۔ لمبا قد' شائستہ غمزدہ اور سوچنے والا' میں نے ان کے الفاظ سننے کے لیے اپنے کان کھڑے کیئے۔ وزیراعظم سمیت پورے ہاؤس نے انہیں زبردستی چپ کرانے کی کوشش کی۔ وہ بڑا خوفناک منظر تھا۔ سپیکر نے نظم و ضبط برقرار رکھنے کے لئے اپنا موگرا توڑ دیا لیکن اس غل غپاڑے سے وہ بھی لطف اندوز ہو رہے تھے۔ مہمانوں کی گیلری سے گلا پھاڑ پھاڑ کر گالیاں برآمد ہو رہی تھیں۔ غدار' بزدل' تمہاری ماں کی ایسی کی تیسی۔ یہ آخری گالی ڈیلی گرانیکل کے مدیر کی تھی جو میرے نزدیک ہی بیٹھا تھا۔ جوابی قہقہے سے شہہ پا کر اپنی ''بذلہ سنجی'' کے اس نمونے کو اگلے دن اس نے اپنے اخبار میں چھاپ بھی دیا اگرچہ ڈاکٹر میکانڈے' سابق وزیر خزانہ نے اپنی تقریر پڑھ کر سنائی جو اچھی طرح تیار کی گئی تھی لیکن ''بنسرڈ'' نے اس کا حلیہ بگاڑ کر شائع کی جس سے وہ تقریر سراسر بے معنی ہوگئی اس میں حسب توقع ڈیڑھ کروڑ پونڈ چھاپنے کا ذکر نہ تھا بلکہ ڈاکٹر میکانڈے سے ایسے الفاظ کہلوائے گئے جو انہوں نے نہیں کہے تھے۔ مختصر یہ کہ بنسرڈ کے عملے نے قطعی نئی چیز چھاپ دی جو برطرف وزیر کی موجودہ کسمپرسی کا پتہ دیتی تھی۔ مثلاً انہوں نے اس کے منہ سے یہ الفاظ کہلوائے۔ ''وہ ایک ذہین ماہر معاشیات کے طور پر سارے یورپ میں مشہور تھے'' جب میں نے یہ پڑھا تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اگرچہ مجھ پر آسانی سے رقت طاری نہیں ہوئی''

یہ شرمناک واقعہ اس تفصیل کے ساتھ میں نے اس لئے سنایا ہے کہ میں یہ واضح کر سکوں کہ معزز چیف نانگا کے لئے میں اس وقت بھی زیادہ جوشیلا پن نہیں رکھتا تھا کیونکہ انہوں نے وزارتی نشستوں کو خالی دیکھ کر اتنا لالچ کیا تھا۔

سکول کا پرنسپل اور مالک دبلا پتلا جو ناتھن نیوئیگے نامی شخص تھا وہ لوکل کونسل کی سطح کی سیاست میں بہت سرگرم تھا اور ہمیشہ بڑبڑاتا رہتا کہ حکمران جماعت نے اس کی

خدمات کی قدر نہیں کی کیونکہ اسے کسی پبلک کارپوریشن میں تکڑی ملازمت نہ مل سکی تھی مگر وہ برہم ہونے کے باوجود مایوس نہیں تھا کیونکہ موجودہ استقبالیہ کی شاندار تیاریاں اس کی گواہ تھیں۔شاید وہ مجوزہ کارپوریشن میں، جو حکومت کی نا قابل استعمال املاک ''مثلاً'' پرانے غالیچے' کرسیاں بجلی کے پنکھے' نا قابل استعمال ٹائپ رائٹر اور دیگر کاٹھ کباڑ'' کو ٹھکانے لگانے کے لئے تیاری کی جانے والی تھی وہ اس کے لئے آس لگائے بیٹھا تھا۔خدا کرے یہ جگہ اسے مل جائے اسے سکول سے نکالنے کا یہی بہترین طریقہ ہے۔

اسے ضد تھی کہ اس کے استقبال کے لئے طالب علموں کو سڑک سے سکول کے دروازے تک کھڑا ہونا چاہئے اور اساتذہ وزیر سے متعارف ہونے کے لئے طالب علموں کی قطار کے آخر میں کھڑے ہوں۔

میں نے بچوں کی طرح قطار میں کھڑے ہونے پر اعتراض کیا تھا کہ دوسرے اساتذہ بھی میری طرح آواز اٹھائیں گے لیکن اس سکول میں تمام اساتذہ گردن سے اوپر مردتھے۔میرے دوست اور رفیق کار انڈریوکویبی نے بھی میرا ساتھ دینے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ اور وزیر ایک ہی گاؤں کے رہنے والے تھے۔میں اس کی فرسودہ قبائلی وفاداری کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں؟

جونہی گاڑیوں کی لمبی قطار کے آگے وزیر کی کیڈلک پہنچی تو شکاریوں نے اپنی آخری گولیاں بھی چلا دیں اور خوشی سے اپنی بندوقیں اچھالنے لگے۔رقاصوں نے اپنی اچھل کود سے خشک ہوا کو گرد آلود کر دیا۔اس شور شرابے میں گانے والی ''گراموفون'' کی آواز بھی دب گئی۔وزیر زرق برق قیمتی لباس میں ملبوس سونے کی زنجیر پہنے اترے۔ انہوں نے جانور کی کھال کا پنکھا لہرا کر استقبالیہ نعروں اور تالیوں کا جواب دیا (جانور کی کھال کا پنکھا کینہ پرور دشمنوں کے بداثرات سے بچانے کے لئے ہوتا ہے) بلاشبہ وہ شخص ہمیشہ کی طرح خوبصورت اور نوجوان لگ رہا تھا۔سکول کے مالک نے اب اس کا تعارف اساتذہ سے کروانا شروع کیا اور قطار کے سرے پر کھڑے سینئر ٹیوٹر سے سب سے پہلے ملوایا اگرچہ میرے پاس سینئر ٹیوٹر کی حالت کا مشاہدہ کرنے کے لیے وقت نہیں تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ اس کے نتھنوں میں حسب معمول نسوار کے نشانات موجود تھے۔وزیر نے ہر ایک کے ساتھ خوش مزاجی سے گفتگو کی۔اس وقت اس کی مسکراہٹ حقیقی لگتی تھی اور اس پر شک

MashalBooks.org

کرنا ذلت کی بات تھی۔اب میری باری تھی۔ میں نے اپنے ہاتھ کو سخت کر کے آگے بڑھایا۔ مجھے ذرا خیال نہیں تھا کہ وہ مجھے پہچان لے گا نہ ہی میں اسے یاد کروانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

ہمارے ہاتھ ملے' میں نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ان کی مسکراہٹ سوچ میں بدل گئی۔اس نے اپنا بایاں ہاتھ زور سے بولتے سکول کے مالک کو چپ کروانے کے لئے لہرایا جس نے وہی طوطا کہانی شروع کر دی تھی جو وہ کم وبیش پندرہ دفعہ دہرا چکا تھا۔''مجھے فخر ہے کہ میں جناب کا تعارف۔''

ہاں ٹھیک ہے ٹھیک ہے انہوں نے کسی خاص شخص کو مخاطب کرنے کے بجائے یونہی کہہ دیا۔اس کے بعد مجھے غور سے دیکھ کر پوچھا''تم اڈیلی ہو؟''''جی ہاں جناب'' اس سے پہلے کہ الفاظ پوری طرح میرے منہ سے نکلتے اس نے اپنے بازوؤں کا حلقہ میرے گرد پھیلا دیا ان کے بے ہنگم لباس میں میرا دَم گھٹنے لگا۔آپ کی یادداشت کمال کی ہے'' میں نے کہا''یہ کم از کم پندرہ سال پہلے کی بات ہے'' اس نے اگرچہ اپنے دونوں بازوؤں سے مجھے رِہا کر دیا ابھی تک میرے کندھوں پر ٹکا ہوا تھا۔وہ سکول کے مالک کی طرف مڑے اور فخر سے کہا۔

میں نے اسے پڑھایا ہے۔''

تیسری جماعت میں''میں نے کہا''

''بالکل'' وہ تیزی سے بولے ایسا لگا کہ اگر ان کا گمشدہ بیٹا بھی مل جاتا تو وہ اتنا خوش نہ ہوتے۔ یہ ہمارے سکول کا ایک ستون ہے۔ مالک نے صورتِ حال کو سمجھتے ہوئے میرے متعلق کہا۔ میرے سکول میں آنے کے بعد پہلی دفعہ اس نے میرے متعلق اچھے کلمات ادا کئے تھے۔

''شاباش اوڈیلی'' وزیر نے خوشی سے کہا اور پھولے ہوئے سانس سے پوچھا ''یہ سارا عرصہ تم کہاں رہے''

میں نے بتایا کہ میں یونیورسٹی میں داخل ہو گیا تھا اور گذشتہ اٹھارہ ماہ سے یہاں پڑھا رہا ہوں۔''بہت لائق لڑکا ہے'' انہوں نے کہا۔ پتہ تھا کہ یہ یونیورسٹی میں جائے گا۔ میں اس کی جماعت کے دوسرے لڑکوں سے کہا کرتا تھا کہ اوڈیلی ایک دن بڑا آدمی بنے گا